اسلام کا تصورِ تاریخ

عبد الحمید صدیقی

(۲)

قرآنِ مجید اس خیال کو بنیادی طور پر غلط سمجھتا ہے کہ روحِ مطلق یا ذرائع پیداوار کے بطن سے جنم لینے والے معاشی روابط انسانی افکار و اعمال کی صورت گری کرتے ہیں۔ روحِ مطلق کے فلسفہ پر ایمان رکھنے والوں کی تعداد چونکہ دنیا میں دن بدن کم ہو رہی ہے اس لیے انسانی ذہن پر اس گمراہ کن نظریے کے نقوش بھی ماند پڑتے جا رہے ہیں۔ لیکن اشتراکیت میں چونکہ ابھی دم خم باقی ہے اس لیے کرۂ ارضی پر انسانوں کی ایک اچھی خاصی تعداد اب بھی ایسی موجود ہے جو یہ سمجھتی ہے کہ ذرائع پیداوار میں تغیرات کی وجہ سے انسانوں کے مابین جو نئے معاشی تعلقات معرضِ وجود میں آتے ہیں وہ اس عہد کے معتقدات اور ان معتقدات کی بنا پر تشکیل پانے والی ہیئت اجتماعی کی تخلیق کرتے ہیں۔ یہ ہے اشتراکیوں کا ذرائع پیداوار کی غیر معمولی اثر آفرینی کے بارے میں اصل نظریہ، مگر وہ اپنے سیاسی مقاصد کے پیشِ نظر اس موقف کو برابر تبدیل کرتے رہتے ہیں اور مذہب پر ایمان رکھنے والی اقوام، خصوصاً مسلمانوں کو، یہ تاثر دیتے ہیں کہ ذرائع پیداوار کے بارے میں اُن کا نقطۂ نگاہ صرف یہ ہے کہ اُن کی تبدیلی معاشرے پر کسی نہ کسی جہت سے اثر انداز ہوتی ہے۔ یہ محض ان کی فریب کاری ہے۔ کوئی معقول آدمی اس امر سے آخر کس طرح انکار کر سکتا ہے کہ جب ذرائع پیداوار بدل جائیں تو یہ تبدیلی معاشرے پر اپنے کچھ اثرات مترتب کرتی ہے۔ مثال کے طور پر برق رفتار ذرائع حمل و نقل نے لوگوں کی نفسیات، معاشرت، سیاست اور معیشت کو کافی حد تک متاثر کیا ہے اور اس کے اثرات زندگی کے ہر شعبے میں بآسانی دیکھے جا سکتے ہیں۔ یہ بات اپنی جگہ درست ہے لیکن اس سے اگر کوئی شخص یہ نتیجہ اخذ کرے کہ ان ذرائع نے انسانی تعلقات میں جو تغیرات

پیدا کیے، انسانی افکار و اعمال سراسر انہیں کے آفریدہ ہیں تو یہ سراسر اس کی نادانی ہے۔ ذرائع پیداوار کے بارے میں اشتراکیوں کا یہ دعویٰ نہیں کہ وہ انسانی زندگی پر اثر انداز ہوتے ہیں، بلکہ ان کا دعویٰ ہے کہ ذرائع پیداوار اور ان کے نتیجے میں ابھرنے والے معاشی تعلقات حیاتِ انسانی کے سارے شعبوں کو اوّل تا آخر ترتیب دیتے ہیں، انسانی زندگی کا کوئی گوشہ اور اس کے قلب و دماغ کا کوئی ریشہ ایسا نہیں رہتا جسے ان تعلقات نے اپنے مخصوص سانچے میں نہ ڈھالا ہو۔

اسلام انسانی زندگی پر خارجی عوامل کے اثرات کی نفی نہیں کرتا لیکن اس نظریے کو ہر طور پر مسترد کرتا ہے کہ خارجی عوامل ہی افراد اور قوموں کے اندر ایک مخصوص قسم کی داخلی کیفیت اور ایک خاص انداز کی اجتماعی اُمنگ پیدا کرتے ہیں۔ اسلام ایمان کو، جو ایک مومن کی زندگی کی اساس اور اس کا نقطۂ آغاز ہے، ایک ایسی جاندار داخلی کیفیت قرار دیتا ہے جو اس کی پوری زندگی کو ایک خاص رنگ میں رنگ دیتی ہے جسے قرآنِ مجید نے صبغۃ اللہ کی اصطلاح سے تعبیر کیا ہے۔ یہ نورِ الٰہی سب سے پہلے مومن کے قلب و دماغ کو منور کرتا ہے اور پھر اس کے نیک اعمال کے ساتھ ساتھ مسلسل پھیلتا جاتا ہے۔ تا آنکہ اس کی پوری زندگی مومنانہ صفات سے جگمگا اٹھتی ہے۔ اس راہ میں خارجی حالات کی مساعدت یا نامساعدت کو یقیناً نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اگر حالات اس انقلاب کے لیے سازگار ہوں تو انسان جلد ہی گوہرِ مقصود پا لیتا ہے۔ اور اگر مخالف ہوں تو اصل منزل تک پہنچنے میں اُسے دشواری پیش آتی ہے۔ لیکن کامیابی یا ناکامی کا سارا دار و مدار خارجی قوتوں پر نہیں بلکہ قوت و طاقت کے اُس سرچشمے پر ہوتا ہے جسے ایمان کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے اور جو انسان کے قلب سے اُبھر کر اُس کی پوری زندگی کو تقویٰ کے آبِ حیات سے سیراب کرتا ہے۔

قرآنِ مجید اس نظریے کو بھی باطل سمجھتا ہے کہ دنیا میں لاشخصی اجتماعیت (COLLECTIVE IMPERSONAL) ہی اصل ہے اور فرد کا علیحدہ وجود محض سراب ہے۔ قرآن مجید کے مطابق فرد کا علیحدہ وجود بھی اتنی ہی بڑی حقیقت ہے جتنی کہ خود اجتماعیت یا پوری کائنات۔ یہاں کوئی چیز بھی بے حقیقت یا بیکار، فریب یا سراب نہیں، بلکہ ہر چیز کا وجود حقیقت ہے اور اس کی بقاء اپنے پیچھے ایک مقدس مقصد رکھتی ہے۔

وَمَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا لٰعِبِيْنَ مَا خَلَقْنٰهُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ - (۴۴ : ۳۹، ۴۰)

(اور ہم نے زمین اور آسمانوں کو اور جو کچھ ان کے درمیان ہے کھیل تماشا نہیں بنایا ہے ہم نے ان کو پیدا نہیں کیا مگر حق کے ساتھ لیکن اُن میں سے اکثر علم نہیں رکھتے)۔

انسان کو کائنات میں ایک فرد کی حیثیت سے جو پیدا کیا گیا ہے تو اُس کا بھی ایک پاکیزہ مقصد ہے۔ اور اس کی پرورش کا ذمہ دار اگر معاشرے کو ٹھیرایا ہے تو اس سے بھی فطرت کے بلند مقاصد کی تکمیل مقصود ہے۔ اس بنا پر یہ سوچنا کہ فرد کے وجود کی اگر کوئی اہمیت ہے تو محض اس بنا پر کہ وہ اجتماعیت کے سیل رواں کی ایک موج ہے، بالکل غلط ہے۔ قرآن مجید اس نظریے کے برعکس فرد کے بارے میں یہ تصور پیش کرتا ہے کہ اس کی اصل اہمیت بحیثیت فرد ہی ہے اور اسی حیثیت سے اُسے آخرت میں اپنی کارگزاریوں کا حساب دینا ہوگا۔ اُسے اگر معاشرے سے وابستہ رہ کر دنیوی زندگی گزارنے پر مجبور کیا گیا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کی صلاحیتیں معاشرے کے اندر ہی صحیح طور پر نشوونما پا سکتی ہیں۔ اور حیات اجتماعی کی نازک ذمہ داریاں اُٹھا کر ہی وہ اپنے انسانی اوصاف نکھار سکتا ہے۔ جس طرح گوہر اپنی آب وتاب کے لیے صدف کا محتاج ہے اسی طرح فرد اپنی اخلاقی اور روحانی ترقی کے لیے ہیئت اجتماعی کا دست نگر ہے۔ لیکن یہ دعویٰ کرنا کہ افراد کا الگ وجود سراب ہے، اسلامی نقطۂ نظر سے انتہائی گمراہ کن ہے۔ اسلام میں فرد کے معاشرے سے تعلق کی نوعیت موج و دریا یا برگ و شجر کی سی نہیں بلکہ قافلے اور اُس میں شامل راہ رو کی سی ہے جو ساتھیوں کے ہم رکاب بھی ہوتا ہے اور اپنا الگ وجود بھی برقرار رکھتا ہے۔

سادہ دل عوام اجتماعیت پرستی کو بھی قوم کے افراد کے مابین اتفاق واتحاد کی ایک پائیدار اور ترقی یافتہ صورت سمجھتے ہیں، حالانکہ یہ دو بالکل الگ نظریے ہیں۔ اتفاق و اتحاد میں افراد کے الگ وجود کو بطور حقیقت تسلیم کر کے ان کے درمیان موانست پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے، جبکہ اجتماعیت پرستی میں افراد کی الگ حیثیت مٹا کر اجتماعیت کا قصر تعمیر کیا جاتا ہے۔ اتحاد میں افراد معاشرے سے تقویت حاصل بھی کرتے ہیں اور اُسے تقویت بہم بھی پہنچاتے ہیں۔ مگر جب وہ اجتماعیت پرستی کے جنون میں گرفتار ہوتے ہیں تو وہ معاشرے کے بحر بیکراں میں اس طرح گم ہو جاتے ہیں کہ اُن کا الگ وجود باقی نہیں رہتا۔ اس جنون کو کوئی دانشمند شخص فرد اور معاشرے کا باہمی تعاون نہیں کہہ سکتا۔ یہ تو خدا کی خدائی کے اقرار کی جگہ معاشرے کی کبریائی کے آگے سرتسلیم خم کرنا ہے اور اس بنا پر خالص الحاد و زندقہ۔ اس نظریے کو تسلیم کر لینے کے بعد انسان نہ تو خدا کا پرستار بن سکتا ہے، نہ اپنے آپ کو اس کے سامنے جواب دہ سمجھ سکتا ہے۔ فلسفۂ اجتماعیت

کا مطلب یہ ہے کہ فرد کا معبود معاشرہ ہے اور اس حیثیت سے وہ اس کا مستحق ہے کہ فرد اُس کی قربان گاہ پر اپنی ہر چیز بھینٹ چڑھانے کے لیے تیار رہے اور اس کی خدمت ہی کو اپنی سب سے بڑی کامیابی تصوّر کرے۔

اسلام نے انسان اور خالق کے درمیان ذاتی تعلق پر بڑا زور دیا ہے اور اُسے یہ بات ذہن نشین کرائی ہے کہ قیامت کے روز وہ فرد ہی کی حیثیت سے باری تعالیٰ کے سامنے پیش ہوگا اور اسی حیثیت سے اپنے اچھے اعمال کی جزا اور اعمالِ بد کی سزا پائے گا۔

اِقْرَاْ كِتٰبَكَ كَفٰى بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيْبًا ۚ مَنِ اهْتَدٰى فَاِنَّمَا يَهْتَدِيْ لِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ ضَلَّ فَاِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيْهَا ۚ وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى ۗ وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا ۔ (۱۷: ۱۴-۱۵)

(اپنی کتاب عمل پڑھ لے آج تیرا نفس ہی تیرا حساب لینے کے لیے کافی ہے جو بھی راہ راست اختیار کرتا ہے تو یہ اُسی کے لیے فائدہ مند ہے اور جو کوئی گمراہی کا راستہ اختیار کرتا ہے تو اس کا وبال اسی پر ہوگا اور کوئی بوجھ اُٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اُٹھائے گا)۔

اسلام نے بلاشبہ شعورِ ذات اور حریّت انسانی پر بڑا زور دیا لیکن اُس نے انفرادیت کو نراج کی راہ پر قطعاً آگے نہیں بڑھنے دیا بلکہ اُسے قوانین خداوندی کی پابند بنا کر اس بات کی ترغیب دی ہے کہ وہ خدا سے تعلق کی بنیاد پر ایسا شریفانہ طرزِ عمل اختیار کرے جس سے نوعِ انسانی کو سکون اور آرام حاصل ہو۔ اسلام صرف اُس نیکی کا قائل نہیں جو انسان کی اپنی ذات تک محدود ہو بلکہ وہ اُس جاندار اور انقلاب انگیز پاکبازی اور شرافت کا علمبردار ہے جس کے اثرات پوری نوعِ بشری پر مترتب ہوں۔ اسلام نے انسان کی انفرادی زندگی اور اجتماعی زندگی کے ظاہری تضاد کو، جو حقیقت میں تضاد نہیں، اس خوبصورتی سے رفع کیا ہے جس کی نظیر دنیا کے کسی معاشرتی ادب میں نہیں ملتی۔ یہاں ہم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث بیان کرتے ہیں جس سے انفرادیت اور اجتماعیت کے درمیان معنوی ربط پوری طرح ذہن نشین ہو جاتا ہے۔

"حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ ارشاد فرمایا کہ ایک فوج کعبے پر لشکر کشی کے لیے نکلے گی لیکن جب وہ چٹیل میدان میں پہنچے گی

تو اُس کا ہراول دستہ اور عقبی حصّہ زمین میں دھنس جائے گا۔ اس پر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے دریافت کیا: "اے پیغمبرِ خدا! یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ تمام فوج، اُس کا ہراول دستہ اور عقبی حصّہ زمین میں دھنسا دیے جائیں جبکہ اُن میں بعض لوگ ایسے بھی ہوں گے جنہیں فوج میں شمولیت پر مجبور کیا گیا ہوگا، وہ از خود اُس میں شامل ہونے پر آمادہ نہیں ہوں گے"۔ لیکن نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "ہراول دستہ اور آخری حصّہ زمین میں دھنسا دیا جائے گا اور پھر انہیں اُن کی نیت اور ارادے کے مطابق قیامت کے دن اُٹھایا جائے گا"۔

اس حدیث سے اس امر کی صراحت ہو جاتی ہے کہ آخرت میں تو ہر انسان کا ایک فرد کی حیثیت سے محاسبہ کیا جائے گا اور اُس کے مطابق اس کا مرتبہ اور مقام متعین ہوگا، مگر اس دنیا میں معاشرے کے ایک رُکن کی حیثیت سے اس سے برتاؤ ہوگا۔ اگر وہ خود نیک ہونے کے علاوہ معاشرے کے اندر نیکی اور بھلائی کو فروغ دے کر ایک صالح معاشرہ قائم کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ پورے معاشرے کو اپنی نوازشات سے بہرہ مند کرتا ہے اور اس طرح وہ شخص دوسرے افراد کے ساتھ ان سے متمتع ہوتا ہے۔ لیکن اگر خدانخواستہ افراد کی کوتاہی کی وجہ سے کسی معاشرے میں بدی غالب رہتی ہے اور اس بنا پر وہ معاشرہ اللہ تعالیٰ کے غضب کا نشانہ بنتا ہے تو نیک افراد اپنی ساری نیکیوں کے باوجود اس مادّی دنیا میں عذاب سے نہیں بچ سکتے، وہ بھی تعذیب میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔

جب معاشرتی ذمہ داریوں کو بطریقِ احسن پورا کرنا دینی اعتبار سے نیکی قرار پائے اور اس بنا پر منعمِ حقیقی سے انعام و اکرام کا مستحق ہو تو اس انسان کا شعورِ ذات معاشرے کے لیے غیر معمولی قدروقیمت کا حامل بن جاتا ہے۔ پھر تاریخی اعتبار سے اُن کی اہمیت متعین ہونے لگتی ہے۔ چنانچہ انسان کے اعمال و افعال کی قدروقیمت کا اندازہ لگانے کے لیے اس کے اخلاص کے ساتھ یہ بھی دیکھا جاتا ہے کہ اس نے اپنی نیکی اور بھلائی کے ذریعے معاشرے میں کس نوع کے افراد پیدا کیے اور بنی نوعِ انسان کی خیر اور بھلائی کے لیے اس نے کس قسم کی خدمات سرانجام دیں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید اس بات پر زور دیتا ہے کہ نوعِ انسانی کے ماضی و حال کے واقعات و تجربات پر غور و فکر کیا جائے اور اس معاشرتی اور اخلاقی نقطۂ نظر کا بھی بہ غور مطالعہ کیا جائے جس نے نوعِ انسانی کو بامِ عروج تک پہنچایا اور اس ضمن میں اُس اخلاقی انتشار کا بھی جائزہ لیا جائے جو اُن کی ہلاکت و بربادی پر منتج ہوا۔

"قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ سُنَنٌ فَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَانْظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِينَ" (۳:۱۳۷)

(تم سے پہلے بہت سی قومیں گزر چکی ہیں، زمین میں چلو پھرو اور دیکھو کہ (حقیقت کو) جھٹلانے والوں کا انجام کیا ہوا)۔

"أَلَمْ يَرَوْا كَمْ أَهْلَكْنَا مِنْ قَبْلِهِمْ مِنْ قَرْنٍ مَكَّنَّاهُمْ فِي الْأَرْضِ مَا لَمْ نُمَكِّنْ لَكُمْ وَأَرْسَلْنَا السَّمَاءَ عَلَيْهِمْ مِدْرَارًا وَجَعَلْنَا الْأَنْهَارَ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهِمْ فَأَهْلَكْنَاهُمْ بِذُنُوبِهِمْ وَأَنْشَأْنَا مِنْ بَعْدِهِمْ قَرْنًا آخَرِينَ" (۶:۶)

(کیا وہ نہیں دیکھتے کہ اُن سے پہلے کتنی ہی قومیں ہیں جن کو ہم نے ہلاک کر ڈالا۔ ہم نے اُن کو زمین پر وہ تمکن و تسلط عطا کیا جو تمہیں بھی نہیں ملا ہے۔ ہم نے اُن پر آسمان سے بارش نازل کی اور اُن کے نیچے نہریں جاری کر دیں۔ پھر ہم نے اُن کو اُن کے گناہوں کی وجہ سے ہلاک کر دیا اور اُن کے بعد ایک دوسری قوم اُٹھا کھڑی کی)۔

"وَكَمْ أَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِنْ قَرْنٍ هُمْ أَحْسَنُ أَثَاثًا وَرِئْيًا قُلْ مَنْ كَانَ فِي الضَّلَالَةِ فَلْيَمْدُدْ لَهُ الرَّحْمَٰنُ مَدًّا حَتَّىٰ إِذَا رَأَوْا مَا يُوعَدُونَ إِمَّا الْعَذَابَ وَإِمَّا السَّاعَةَ فَسَيَعْلَمُونَ مَنْ هُوَ شَرٌّ مَكَانًا وَأَضْعَفُ جُنْدًا" (۱۹: ۷۴، ۷۵)

(ان سے پہلے کتنی ہی قومیں ہم نے ہلاک کر دی ہیں حالانکہ وہ بہترین اثاثہ اور نمائش کی مالک تھیں۔ کہہ دیجیے اُس شخص کو جو گمراہی میں گرفتار ہے تو اللہ تعالیٰ اُس کی رسّی دراز کر دیں گے یہاں تک کہ وہ حقیقت کا مشاہدہ کر لیں گے جس کا ان سے وعدہ کیا تھا عذاب کا یا قیامت کا۔ پھر وہ جان لیں گے کہ کس کا مقام سب سے بُرا ہے اور کس کا لشکر سب سے زیادہ کمزور ہے)۔

اسلام انسان کو اس امر کی تلقین کرتا ہے کہ وہ زندگی کے مختلف واقعات کے محض ظاہری عوامل کو پیش نظر نہ رکھے بلکہ اُن محرکات کا مطالعہ کرے جن کی بدولت یہ واقعات رونما ہوتے ہیں۔ قرآن مجید میں "تاریخی واقعات اور ماضی کے حالات کا جو تذکرہ کیا گیا ہے اُس کا مقصد یہ نہیں کہ ہماری معلومات میں جو کمی رہ

گئی ہے اسے پورا کیا جائے یا لوگوں کے ذہنوں میں محض ان کی یاد تازہ کی جائے بلکہ اس کا مقصد یہ ہے کہ لوگ ان واقعات کو اُن کے اخلاقی پس منظر میں پڑھ کر یا سُن کر اُن سے نصیحت حاصل کریں ۔ چنانچہ قرآن مجید نے ان واقعات کا انتخاب ، ان کی تشریح و توجیہ اور ان کے مابین معنوی ربط اخلاقی اور روحانی نقطۂ نظر ہی سے پیدا کیا ہے ۔

علمِ تاریخ کے بارے میں اسلام کا نقطۂ نگاہ بھی بڑا انقلاب انگیز ہے ۔ مسلم مورخین نے انسانی ترقی کے سارے مراحل کا جائزہ لیتے ہوئے صرف معروضیت (OBJECTIVITY) اور صحتِ واقعات کے ارفع معیارات ہی کو پیشِ نظر نہیں رکھا بلکہ اس ترقی کی بنیاد اور انسان کی منزلِ متعین کرنے کی بھی کوشش کی ۔ اس امر کی وضاحت کے لیے آپ ابن خلدون کی مشہور تصنیف "کتاب العبر و دیوان المبتدا والخبر فی ایام العرب والعجم والبربر" ملاحظہ فرمائیں ۔ یہاں "عبر" کا لفظ بنیادی اہمیت کا حامل ہے جو اُس فکر کو ظاہر کرتا ہے جس کے پیشِ نظر مسلمانوں نے تاریخ کا مطالعہ کیا ۔

(بقیہ اسلام کا قانون سرقہ)

قطع ید کی سزا میں معافی جائز نہیں ہے نہ مسروقہ مال کے وارث کی طرف سے اور نہ مملکت کے سربراہ کی طرف سے ۔ اور نہ اُسے کسی اور سزا میں تبدیل کیا جا سکتا ہے ۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے : تجافوا العقوبة بینکم ، فاذا انتھی بھا الی الامام فلا عفا اللہ عنہ ان عفا (آپس ہی میں عقوبت کے نفاذ کو روکو ۔ لیکن اگر معاملہ امام تک پہنچ جائے تو اگر وہ معاف کر دے تو خدا اسے معاف نہ کرے) ۔ سزا کے نفاذ میں تاخیر بھی جائز نہیں ہے ۔ یہ وہ بنیادی اصول ہیں جن پر تمام امت متفق ہے ۔